فن تحقیق کی منہاجیاتی تشکیل میں مسلم متقدمین کا کردار

The Role of Early Muslim Scholers in formation of Research Methodology

ڈاکٹر محمد فیروزالدین شاہ کھگہ*

ڈاکٹر محمد شہباز منج**

Abstract:

Muslim researchers have offered a massive biographical library which ran into thousands of volumes. An integral part of this methodological science is the isn┐ d scheme which culminated and elevated till it became a solid part of basic Islamic principles. In this way most of the methodological studies and research sciences came into existence in the early phase of Islamic traditional era. However, some western scholars have claimed and propagated that there is no major role or contribution by Muslims in the development and promotion of the research. They also asserted that the credit of inception of the research in studying the textual status of the script belonged to the western researchers. This assertion was banged in such a loud manner as some Muslim intellectuals were also affected as well and could not escape with its aftermaths. In this paper an exclusive study has been focused in reference to highlight the paramount contribution of Muslim researchers and historiographers in the field of research in Islamic Studies.

حقائق کی تلاش و جستجو کا منضبط فن بحث یا تحقیق کہلاتا ہے، انسانی فطرت نے ہمیشہ نفس اور کائنات کے سربستہ رازوں کے کھوج لگانے میں اپنے بے پایاں تجسس کا نمایاں اظہار کیا ہے، اسی خاصیت کے باوصف وہ مختلف مراحل حیات میں آغاز سے اختتام تک اپنی ذات سے وابستہ گردوپیش کے ظروف واحوال کی حسب ضرورت تعبیر کرتا ہے اور اسی کی بدولت اپنے جذبات وخیالات کو روبہ عمل لانے کی سعی کرتا ہے ۔ علم وفن کے شعبوں میں تو تحقیق روح کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ اس کے ذریعے کسی موضوع سے متعلقہ مواد کو مرتب کیا جاتا ہے، اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے، اس پر تنقید کی جاتی ہے اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج سے دوسروں کو آگاہ کیا جاتا ہے۔ تحقیق و جستجو مسلم محققین کا طرۂ امتیاز رہا ہے، اس کے پس منظر میں

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ سرگودھا۔

** اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ سرگودھا.

قرآن کریم کی جابجا انسانوں کو دعوت غور و فکر اور گرد و پیش کی دنیا سے جڑے، مناظر قدرت کا مشاہدہ کرنے اور قوموں کے عروج و زوال کے محرکات و عوامل کا جائزہ لینے کی قوت محرکہ ہے۔

جدید علمی اصطلاحات کی رُو سے قرآن قادر مطلق اللہ رب العالمین کی تخلیق کردہ دنیا کی حقیقتوں کو سمجھنے کے لیے تجربی طریق کار تجویز کرتا ہے۔۔اس بناء پر تجربی طریق کار، مشاہدہ، تجربہ، توثیق، اور نتائج کی بنیاد پر تصدیق مسلمانوں کی منہاجیات کا لازمی حصہ بن گئے۔اور یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ثقافت اور تاریخ کے لیے قیمتی خدمات انجام دینے والے مسلمان مفکرین، علماء و فضلاء، محققین اور تکنیکی ماہرین نے اپنی علمی کاوشوں میں ہدایت الٰہی، انسانی عقل و دانش، اور تجربی طریق کار تینوں سے استفادہ کیا۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے انسانی تاریخ میں علم و دانش کے چار ممتاز اسالیب (Paradigm) کی نشان دہی مفید ہو گی۔پہلا اسلوب خدائی ہدایت پر مشتمل معرفت پر مبنی ہے۔یہ ایک بلند تر ذریعہ ہے، وہ ذریعہ جس نے کائنات کو تخلیق کیا، علم کے اُس حصے میں انسان کی شرکت جو خالق کی فکر پر مشتمل ہے، زمین پر انسان کے کردار کے لیے بنیادی اہمیت اور افادیت کی حامل ہے۔تمام مذہبی، بالخصوص اسلامی، اسلوب کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔دوسرا اسلوب جو باطنی علم کی حیثیت سے معروف ہے، اس کی بنیاد وجدان پر ہے۔تیسرا اسلوب استدلال اور عقل پر مبنی ہے، اس تصور کے ساتھ کہ کائنات کی ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کا ادراک عقل کی مدد سے ممکن ہے۔عقل، حواس خمسہ کے ذریعے روبہ عمل آتی ہے جبکہ وجدان اِن سے بالاتر ہے۔عقل ایک صلاحیت کا نام ہے، ایک قوت جسے تجربے، خبر اور علم کے ذریعہ کی حیثیت سے انسان استعمال کرتا چلا آرہا ہے۔ریاضی اور جیومیٹری کا تمام تر ارتقاء اس مفروضے کی بنیاد پر ہوا کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو وجود رکھتی ہے، لیکن صرف عقل ہی کے ذریعے ہم اسے اپنی گرفت میں لاسکتے ہیں۔چوتھا اسلوب تجربی جہت ہے جس میں اطلاع، حقائق اور علم کو مشاہدے اور تجربے کے عمل سے دریافت کیا جاتا ہے، جس میں قیاس یا مفروضے کی تصدیق یا تردید تجربہ سے حاصل شدہ نتائج کے ذریعے کی جاسکتی ہے، اور جس میں اس طریق کار کی بناء پر پیش گوئی ممکن ہے۔فی الحقیقت آج کا المیہ یہ ہے کہ یہ چار بڑے اسلوب اس مفروضے کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رکھے گئے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک خود کفیل ہے۔اس معاملے میں اسلام کا کردار یہ ہے کہ وہ علم کی ان چاروں راہوں کو تسلیم کرتا، انہیں ایک لڑی میں پروتا، اور ایک ایسا بلند محرابی (Overarching) بندوبست ایجاد کرتا ہے جس میں خدائی ہدایت کا مقام سب سے بلند ہے جبکہ وجدان، عقل، استدلال اور تجربہ اس چھتری تلے اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ان میں سے ہر ایک دوسرے کی مدد اور تکمیل کرتے ہوئے اسلامی اسلوب کو ایک کل بناتا ہے۔اس جامع اور ہمہ گیر اسلوب کا اطلاق اپنی تحقیقی کاوشوں پر کر کے مسلمانوں نے اسلامی دور کی پہلی صدی کے دوران ہر میدان میں طبعی اور سماجی علوم (Natural and social sciences) کو ترقی دی۔فی الحقیقت انہوں نے قرآنی علوم سے ابتداء کی، اور قواعد، زبان، تفسیر، حدیث، تاریخ، علم الرجال، اصول فقہ یعنی اصل

ذرائع سے قانون اخذ کرنے کا پورا عمل، نیز متعدد دوسرے علوم کو پروان چڑھایا۔ اس کے بعد یونان سے فکری چیلنجوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا اور معتزلہ اور اشاعرہ کی علمی تحریکوں نے ان کا کامیابی سے مقابلہ کیا جس کی نتیجے میں اسلامی فلسفے کی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔ خدائی ہدایات اور تقاضوں کی تکمیل کے عمل میں مثلاً قرآن کو تحریر کرنے کے لیے مسلمانوں نے کاغذ سازی ور قلم سازی کو ترقی دی، روشنائی کو چمک دار اور دیر پا بنانے کے لیے کیمیائی تجزیے کیے، اور یوں طبعی علوم (نیچرل سائنس) کی ترقی میں حصہ لیا۔ امام غزالی، ابن خلدون، ابن تیمیہ جیسے مفکروں نے اپنے اپنے انداز میں ان علوم کو ترقی دی جنہیں آج عمرانی علوم(سوشل سائنس) کی حیثیت حاصل ہے۔ ابن خلدون کو اب عمرانیات اور فلسفہ تاریخ کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ کتاب الخراج معاشیات کے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو امام ابویوسف نے لکھی۔ [1]

اسی طرح سیرت نگاری اور نقد حدیث کے لئے بھی مسلم محققین نے ایسے اصول وضع کئے جن کی روشنی میں تحقیقات کے ذریعہ سے علم جرح وتعدیل اور اسماء الرجال کا ایک ایسا عظیم الشان فن وجود میں آیا جس کی مثال دنیا کے کسی لٹریچر میں نہیں ملتی۔ اگرچہ یہ بات درست ہے کہ جدید عصری مناہج واسالیب تحقیق اور سائنسی اکتشافات وایجادات کے میدان میں اب ہمارا وہ حصہ اور کردار نہیں رہا جو ایک ایسی قوم کا ہونا چاہیئے تھا جس نے علمی ورثہ کے طور پر تحقیق کا ایک بیش بہا خزانہ پایا ، تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ مسلم محققین نے ماضی میں نہ صرف یہ کہ تحقیق وتدوین کے اصول وضوابط تشکیل دئے بلکہ یونانی اسالیب کی نقد وتصحیح میں بھی اپنا کلیدی کردار ادا کیا۔

اس کے برعکس بعض مغربی دانشوروں نے اپنی ناواقفیت یا علمی خیانت کا ثبوت دیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ فن تحقیق کی تدوین وارتقاء میں مسلمانوں کا کوئی حصہ (Contribution) ہی نہیں ہے، بلکہ اس فن کی ابتداً مغرب سے ہوئی ہے، بعض سرسری نظر رکھنے والے عربوں نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ چنانچہ معروف عرب محقق ڈاکٹر رمضان عبدالتواب ایسے ہی لوگوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یظنّ بعض الباحثین المحدثین من العرب انّ فن تحقیق النصوصِ فن حدیث ابتدعه المعاصرونَ من المحققین العرب او استقوه عن المستشرقین الذین سبقونا فی عصر الحاضر بعض الوقت فی تحقیق شئ من تراثنا و نشر بین الناس"[2]

حقیقت تو یہ ہے کہ اہل مغرب نے پندرہویں صدی عیسوی میں یونانی اور لاطینی ادب کو زندہ کرنے کا اہتمام کیا اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ جب ان کو کوئی قدیم کتاب ہاتھ لگ جاتی تو وہ لوگ اس کے دوسرے نسخوں کی تتبع اور تلاش کئے بناء اسے چھاپ دیتے۔ چنانچہ ان کتب میں موجود بڑی غلطیوں کی تصحیح کی جاتی اور چھوٹی غلطیوں کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عبدالہادی فضلی لکھتے ہیں:

"وکان بدء نشوء هذه المادة فی اوربا خلال القرن الخامس عشر المیلادی ، وذالک عندما قام بعض العلماء الاوربیین بنشر بعض المخطوطات الیونانیة

والّلاتینیة، وکان عملهم فی هذا لا یتعدی حدود الطبع البدائی الذی کان یتعمد فیه علی نسخة واحدة، وقد تکون غیر مصححة ولا معتنی بها فنیاً"[3]

بعد ازاں جب قدیم ادب نے ترقی کی تو یہ طریقہ اپنایا گیا کہ کسی قدیم کتاب کے کئی نسخوں کو جمع کیا جاتا، ان کا باہمی تقابل کر کے جہاں جہاں اختلاف پایا جاتا، وہاں وہ کسی ایک روایت کو راجح قرار دے کر نص کتاب بناتے اور مابقیہ روایات کو حاشیہ میں لکھ دیتے، اس کے واسطے انہوں نے کچھ اصطلاحات مقرر کی تھیں جن کی بنیاد پر وہ قدیم نسخوں میں موجود روایات کو پرکھتے، لیکن چونکہ یہ ابتدائی مرحلہ تھا اس لئے ان کے سامنے کوئی معلوم طریقہ کار اور متعین قواعد موجود نہیں تھے، چنانچہ انیسویں صدی کے نصف تک یہی طریقہ کار جاری رہا، اس کے بعد نصوص وعبارات کو پرکھنے کے لے باقاعدہ قواعد وضع کئے گئے اور اس حوالے سے کتابیں لکھی گئیں۔ چنانچہ ڈاکٹر عبد الہادی فضلی مزید لکھتے ہیں:

" وبحلول القرن التاسع عشر المیلادی تطورت الخبرات فی نشر المخطوطات الی وضع اصول وقواعد علمیة لتحقیق النصوص رفعت هذه المادة الی مستوی العلم"[4]

مسلمانوں کو فن تحقیق کو باقاعدہ مدون کرنے کی ضرورت اس وقت تک نہیں پڑی جب تک کہ ان کے ہاں شفوی روایات پر اعتماد باقی تھا، چنانچہ ان کے ہاں صرف لکھے ہوئے کلمات پر اعتماد نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ان کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اسی طرح کسی کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ کسی کتاب کی تدریس کرے، یا اپنی تالیف میں اس سے کوئی اقتباس نقل کرے جب تک کہ وہ اس کتاب کو بذات خود مولف، اس کے شاگرد یا شاگرد کے شاگرد (الی آخرہ) سے نہ پڑھے اور ان سے باقاعدہ تدریس کی اجازت نہ لے، یہ طریقہ اب بھی قرآن مجید اور اس کے حفظ کے حوالے سے باقی ہے کہ کسی کے قرآن مجید کے تلاوت کو اس وقت تک قبول نہیں کیا جاسکتا ہے جب تک کہ وہ کسی ایسے استاد سے نہ پڑھے جو کہ اساتذہ کے اس لڑی کا حصہ ہو جنہوں نے بالترتیب ایک دوسرے سے پڑھا ہو۔

قرون اولیٰ کے علماء نے مذکورہ طریقے کا بڑا اہتمام کیا، یہی وجہ ہے کہ وہ کسی ایسے آدمی پر اعتبار نہیں کرتے تھے جو صرف لکھی ہوئی کتابوں پر اعتماد کرتا ہو، بلکہ ایسے آدمی کو صحفی (وہ آدمی جس نے علم صرف صحیفوں سے حاصل کیا ہو باقاعدہ اساتذہ سے نہیں پڑھا ہو) کہتے تھے . چنانچہ حسن بن عبد اللہ بن سعید العسکری (م ۳۸۲ھ) نے متعدد مثالوں سے صحفی کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے صراحت کی ہے:

"لا تاخذوا القرآن من مصحفی ولا العلم من صحفی ۔۔۔۔۔ فقد قال الخلیل : ان الصحفی الذی یروی الخطاء علی قراءة الصحف، باشباه الحروف، وقال غیره: اصل هذا ان قوما کانوا اخذوا العلم عن الصحف من غیر ان یلقوا فیه العلماء، فکان یقع فیما یرونه التغییر"[5]

قدیم عرب شاعر ابو نواس اپنے استاد کی مدح کرتے ہوئے تصحیف و تحریف کی اہمیت کے بارے میں اس طرح تذکرہ کرتا ہے:

لا یتهم الحاء فی القراءۃ مع ال خاء و لا لامها مع الالف
و لا یعمی معنی الکلام و لا یکون اسناده عن الصحف[6]

البتہ اگر کسی وجہ سے مجبوراً استاذ سے سنے بغیر صرف کتاب سے نقل کرنے پر اکتفاء کیا جاتا تو ساتھ ہی اس بات کی وضاحت بھی کی جاتی تھی کہ میں نے یہ شیخ سے نہیں سنا ہے۔ چنانچہ علامہ جوہری (م ۳۹۵ھ) نے اپنی کتاب الصحاح میں یہ قول ذکر کیا ہے کہ " لجذ الکلب الاناء لُجذا و لَجذا ای لحسه "۔ اس لغت کو ابو حاتم (م ۲۵۰ھ) نے بیان کیا ہے، میں نے ان کی کتاب الابواب سے نقل کیا ہے، مگر ان سے سنا نہیں ہے۔[7] مگر زمانے کے گزرنے کے ساتھ صرف شفوی روایات کے ذریعے تحمل علم مشکل ہو گیا ، چنانچہ مسلمانوں میں حصول علم کے لئے "وجادہ"[8] کا طریقہ بھی عام ہو گیا، یہی وجہ ہے کہ قدیم عرب علماء کے ہاں نصوص و عبارات کی تحقیق کے لئے قواعد وضع کرنے کی بنیادی وجہ "وجادہ" کا عام ہونا تھا چنانچہ چوتھی صدی ہجری میں یہ قواعد نہ صرف فن کے شکل میں سامنے آئے بلکہ اس حوالے سے کتابیں بھی لکھی گئیں۔ اس موضوع پر عربی زبان میں تحقیقی کتب اور مقالوں کی صورت میں کافی کام ہوا ہے چنانچہ قدیم کتب میں قاضی عیاضؒ (م ۵۴۴ھ) کی کتاب " الالماع الی معرفۃ اصول الروایۃ و تقیید السماع "، علامہ ابن الصلاحؒ (م ۶۱۶ھ) کی کتاب " مقدمۃ ابن الصلاح " اور علامہ علمویؒ (م ۹۸۱ھ) کی کتاب " المعید فی ادب المفید و المستفید " خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان کتابوں میں دقیق علمی اور مصطلحاتی اسلوب کے سبب معاصر منہج بحث کے قواعد و ضوابط پر مناسب تطابق کافی تعمق اور عرق ریزی کا کام ہے ، البتہ اس فن کی عصری علمیاتی تناظر میں توضیح و تفہیم سے ہی یہ ثابت کیا جاسکے کہ فن تحقیق کا اصل موجد کون ہے اور مستشرقین کے مذکورہ بالا دعویٰ میں کس قدر صداقت ہے ؟[9]

نصوص و عبارات کی تصحیح و حفاظت کے سلسلے میں علماء متقدمین کا طرز عمل:

ما قبل میں اس بات کا تذکرہ ہوا تھا کہ قدیم عرب علماء کے ہاں نصوص و عبارات کی تحقیق کے لے قواعد و ضوابط وضع کرنے کی بنیادی وجہ "وجادہ" کا عام ہونا تھا چنانچہ چوتھی صدی ہجری میں یہ قواعد نہ صرف فن کے شکل میں سامنے آئے بلکہ اس حوالے سے کتابیں بھی لکھی گئیں۔ چنانچہ آنے والی عبارت میں ان قواعد میں سے بعض ذکر کئے جاتے ہیں:

۱۔ مخطوط کے متعدد نسخوں کا باہم تقابل:

دور جدید کے محققین کسی کتاب کی تحقیق کے لے یہ بات لازمی قرار دیتے ہیں کہ اس کتاب کے متعدد نسخوں کا باہم تقابل کر لیا جائے، تا کہ اس کتاب کی صحیح عبارت کی تعیین ہو سکے۔ مگر جب ہم اپنی تاریخ

پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ ہمارے قدیم محققین علما ء کے ہاں مکمل وضاحت کے ساتھ موجود تھا۔ چنانچہ علامہ علموی (م ۹۸۱ھ) طالب علم کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ:

"طالب علم کو اپنے مکتوب کا تقابل صحیح اور معتمد نسخے کے ساتھ کرنا چاہیے۔ حضرت عروہ ابن زبیرؓ نے اپنے بیٹے ہشام کو مخاطب کر کے فرمایا: کیا تم نے لکھ دیا ہے؟ جواباً ہشام نے فرمایا ہاں لکھ دیا ہے۔ حضرت عروہ نے دوبارہ ارشاد فرمایا : اپنے مکتوب کا کسی صحیح ، معتمد نسخے سے تقابل بھی کیا ہے؟ اس نے عرض کیا، نہیں، حضرت عروہ نے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ اس طرح نہ لکھیں، امام شافعی اور یحیٰ ابن کثیر فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص نے لکھا اور اپنے لکھے ہوئے کا تقابل نہیں کیا وہ اس شخص کی طرح ہے جو بیت الخلا میں داخل ہو اور استنجا نہ کرے۔"[10]

قاضی عیاض (م ۵۴۴ھ) مزید وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کاتب کو چاہیے کہ اپنے نسخے کا اصل کے ساتھ حرف بحرف تقابل کرے تا کہ اس معارضے کے بدولت اس کو مکمل اعتماد اور یقین حاصل ہو۔ اسی طرح کسی ثقہ جان کار آدمی کے لکھنے پر بغیر تقابل کیے اعتماد نہ کرے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے پر بھی اعتماد نہ کرے۔ اس لیے کہ فکر بھٹک سکتی ہے، دل غلطی میں مبتلا ہو سکتا ہے اور نظر دھوکا کھا سکتی ہے"[11]

جب ایک کتاب کے نسخوں میں اختلاف ہو جاتا تھا تو علمائے متقدمین وہی طرز عمل اپناتے تھے جو کہ جدید دور کے محققین حضرات اپنائے ہوئے ہیں۔ یعنی وہ ایک بنیادی نسخہ جسے ام النسخ کہا جاتا تھا، کو اختیار کرتے اور دوسرے نسخوں میں وارد شدہ کمی وزیادتی یا اختلا ف روایت کو اس بنیادی نسخہ کے حاشیہ کی صورت میں لکھ دیا جاتا تھا، لیکن ساتھ ساتھ ایسی رموز و علامات بھی استعمال کیے جاتے جس سے اندازہ ہو تا کہ حاشیہ پر مذکور عبارت کس نسخہ یا کس شخص کی ہے۔ اس قاعدے کی عملی مثال علامہ یاقوت حموی (م ۶۲۶ھ) کا تذکرہ ہے جو انہوں نے معجم الادباء میں مفضل الضبی کے حالات زندگی کے تحت لکھا ہے کہ ان کے کئی مفضلات ہیں، مفضلات سے مراد ان کے وہ منتخب کردہ اشعار ہیں جن کو مہدی نے لکھا ہے اور اس کے بعض نسخوں میں کمی وزیادتی بھی ہے۔ لیکن زیادہ صحیح نسخہ وہ ہے جس کو عبداللہ ابن الاعرابی نے روایت کیا ہے۔[12]

۲۔ تصحیح اغلاط:

متقدمین اس بات پر بڑا زور دیتے تھے کہ کسی بھی مکتوب میں موجود غلطی کی تصحیح اس وقت تک نہ کی جائے جب تک کہ خوب چھان بین کے بعد اصل حقیقت واضح نہ ہو جائے، اسی طرح یہ بھی لازم قرار دیتے تھے

کہ اگر محقق اس غلطی کی تصحیح کر دے تو تصحیح سے پہلے والی عبارت کی طرف ضرور اشارہ کرے۔ اس قاعدے کے حوالے سے قاضی عیاضؒ لکھتے ہیں:

"مشائخ کا طرز عمل یہ رہا ہے کہ وہ روایت کو اسی طرح نقل کرتے ہیں جیسے وہ ان تک پہنچی ہے اور اپنی کتابوں میں ان کو نقل کرتے ہوئے تصحیح نہیں کرتے ہیں لیکن جانکار لوگ سنتے، پڑھتے یا کتابوں کی حواشی میں ان غلطیوں پر تنبیہ کر جاتے ہیں۔ بعض علماء ایسے بھی ہیں جو تصحیح اغلاط کی جسارت کر بیٹھتے ہیں متاخرین میں اس حوالے سے قاضی ابو الولید الوقشی مشہور ہے"[13]

البتہ بعض متقدمین قرآنی نصوص میں کتابت کی اصلاح کو ضروری سمجھتے ہیں چناچہ علامہ علمویؒ فرماتے ہیں کہ:

"صاحب کتاب کی اجازت کے بغیر کتاب میں تصحیح کرنا بھی جائز نہیں ہے، سوائے قرآن کریم کے کیونکہ اگر اس کی کتابت میں کوئی غلطی یا لغزش واقع ہوئی ہو تو اس کی اصلاح کی جائے"[14]

علماء متقدمین نے نصوص وعبارات کی اصلاح کے طریقے اور اس حوالے سے استعمال ہونے والے رموز واشارات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ جس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے ہاں اس عمل کا کتنا اہتمام تھا، چنانچہ حقیقت جانے بغیر عبارت کی اصلاح کرنے والے پر انہوں نے حیرت کا اظہار کیا ہے، بلکہ بطور طنز اس عمل کو مصلح کی جرات قرار دیا ہے۔ قاضی عیاض لکھتے ہیں :

"تصحیح وتصویب اور تمریض کرنا ماہرین اور پختہ کاروں کا کام ہے۔ یہاں پر تصحیح سے مراد ایسے کلام پر لفظ (صح) لکھنا ہے جو کہ روایتاً اور معناً دونوں اعتبار سے صحیح ہو۔ مگر یہ کہ اس میں کچھ شک وخلاف رہا ہو، چنانچہ اس کے اوپر یا اس کے قریب لفظ (صح) لکھ دیا جائے گا، تاکہ اس طرف اشارہ ہو کہ یہ عبارت میری نظر سے گزری ہے اور میں اس سے غافل نہیں رہا بلکہ اس سے موافقت کرتا ہوں"[15]

علامہ علموی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"محقق کو چاہئے کہ جس امر کی تصحیح وتضبیط کر دے، جو کہ دوران مطالعہ اس کو مشکوک لگا ہو یا شک کا احتمال رہا ہو، تو اس کے اوپر چھوٹا سا لفظ (صح) لکھ دے، اسی طرح اگر تصنیف وتالیف میں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو اس کے اوپر چھوٹا سا لفظ (کذا) لکھ دے، جس کا مطلب یہ ہو گا کہ اسی طرح میں نے دیکھا ہے۔ اور پھر جب حاشیہ میں باقاعدہ تحقیق کر کے تصحیح کر لے تو ساتھ میں (صوابہ کذا) لکھ دے، وگرنہ اندازہ اور تخمین کی صورت

میں (لعلہ کذا) لکھ دے۔ اسی طرح اگر کوئی ایسا مقام اشکال ہو جس کی توجیہ وہ بیان نہ کر سکے تو وہاں پر لفظ صاد کی طرح خط کھینچے، اس کے لکھنے سے محقق کے پیش نظر دو مقاصد ہوتے ہیں، ایک یہ کہ یہ کلام مکمل طور صحیح نہیں ہے، دوسرا اس سے ناظرین کو تنبیہ کرنا مقصود ہوتا ہے کہ عبارت کے نقل کرنے میں مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے لہٰذا عبارت کے نقل کو قابل تصحیح نہ سمجھا جائے، مگر جسارت کرنے والوں نے جسارت کرلی اور نتیجۃً غلط عبارت کو صحیح کی جگہ پر رکھ دیا"[16]

قاضی عیاض اپنی سند سے علامہ افلیلی کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

"ہمارے ادباء مشائخ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب کسی کلام پر لفظ "صح" لکھ دیتے اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس میں کسی طرح کی غلطی و نقصان کے وہم کی گنجائش نہیں ہے اور جب صرف "ص" کو بغیر "ح" کے لمبا کر کے لکھ دیا جاتا تو اس کلام کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کلام میں یک گونہ سقم موجود ہے"[17]

علمائے متقدمین کے اصلاح خط کے حوالے سے بنائے گئے مذکورہ قاعدے کی تطبیقی مثال علامہ ثعالبی (متوفی ۴۲۹ھ) کا یہ قول ہے جو اس نے اپنی کتاب "یتیمۃ الدہر" میں بیان کیا ہے": **اهديت نبرة اهدت لا كلها كرب المطامير في أب وتموز** "اس کے بعد فرمایا کہ میرے پاس موجود نسخہ میں لفظ "نبرۃ" ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کوئی ایسی چیز ہو جو دانوں کو پیس کر شکر میں ملانے سے بنتی ہو۔[18] یہاں دیکھئے کہ علامہ ثعالبی کو چونکہ لفظ "نبرۃ" کی اصل حقیقت کا پتہ نہیں چل سکا اس لئے انہوں نے اس کلمے کو برقرار رکھا اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی۔

۳۔ ساقط شدہ عبارت کے سلسلے میں علمائے متقدمین کا طرز عمل

علمائے متقدمین کا طرز عمل یہ تھا کہ اگر کسی مخطوطہ کے عبارت میں سے کچھ رہ جائے، پھر صاحب مخطوطہ چاہے کہ اس عبارت کا اضافہ ہو تو وہ اس کو بین السطور لکھنے کی بجائے حاشیہ میں لکھتے تھے، تاکہ صفحے کی خوبصورتی میں خلل نہ پڑے، اس حوالے سے وہ دوسرا کام یہ کرتے تھے کہ اضافہ شدہ عبارت کے اصل مقام پر "علامت الحاق" لگا دیتے، جس سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا تھا کہ اضافہ شدہ عبارت کا اصل مقام یہ ہے، اس علامت کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ عبارت کے اصل مقام پر ایک خط کھینچ لیا جاتا تھا جس کا سرا حاشیہ کی مناسبت سے مائل کیا جاتا تھا، چنانچہ حاشیہ کے دائیں جانب ہونے پر خط کا سرا دائیں جانب اور بائیں جانب ہونے پر خط کا سرا بائیں جانب کر دیا جاتا۔ اس حوالے سے قاضی عیاضؒ اپنی کتاب "الالماع" میں فرماتے ہیں:

" اگر اصل عبارت کا کچھ حصہ رہ جائے تو اس کے اضافہ کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں پر نقص وارد ہوا ہو اس سطر کے اوپر ایک خط کھینچا جائے جس کا سرا حاشیہ میں بڑھائے گئے عبارت کی طرف ہو پھر حاشیہ میں اضافہ کردہ عبارت کو "علامت الحاق" کے بالکل سامنے رکھا جائے اور آخر میں لفظ "صح" لکھ دیا جائے"[19]

ان علماء نے صرف اس طریقے کے بیان پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ اس طرز کے حواشی اور دوسرے وضاحتی یا تنبیہی حواشی میں فرق کو بھی واضح کیا ہے، تاکہ التباس سے محفوظ رہا جاسکے، بقول قاضی عیاضؒ:

"جہاں تک ان تنبیہی یا تفسیری حواشی کا تعلق ہے تو ان کے لئے اس طرح کے تخریج کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ اس سے التباس ہو جائے گا اور لوگ ان کو بھی اصل کا حصہ سمجھ بیٹھیں گے"[20]

۴۔ کسی زائد کلمے کے سلسلے میں علمائے متقدمین کا طریقہ کار:

زائد یا غلط عبارت پائے جانے کی صورت میں علمائے متقدمین نے تین طریقے اختیار کئے ہیں :

1. الکشط: یعنی اس زائد عبارت کو چھری یا کسی چیز سے پھاڑ دیا جائے۔
2. اس لکھے عبارت کو مٹا دیا جائے اور یہ طریقہ ماقبل کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے۔
3. اس لکھے ہوئے پر کوئی چیز پھیر دی جائے، یہ ان کے ہاں سب سے پسندیدہ طریقہ تھا، خاص طور پر کتب حدیث میں اسی طریقہ کو اپنایا گیا، اس کی کیفیت میں پانچ اقوال ہیں :

(الف) اس عبارت پر ایک لمبی لائن کھینچی جائے جو تمام کلمات کو آپس میں ملائے۔

(ب) اس عبارت کے اوپر ایک ایسی لمبی لائن کھینچی جائے جس کا ایک سرا اس عبارت کی ابتدا اور دوسرا انتہاء پر ہو۔

(ج) عبارت کے شروع میں لفظ "لا" اور آخر میں لفظ "الی" لکھ دیا جائے۔ جو اس طرف اشارہ کرے گا کہ یہاں سے وہاں تک عبارت قطع کر دی گئی ہے۔

(د) عبارت کے شروع اور آخر کو بریکٹ [..................] میں بند کر دیا جائے۔

(ھ) اس عبارت کی ابتدا اور انتہاء پر دائرہ (o) لگا دیا جائے۔[21]

قدیم محققین کے اختیار کردہ مذکورہ بالا طریقوں کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عبارت کی تصحیح کے سلسلے میں انہوں نے جس اہتمام کا مظاہرہ کیا ہے وہ شاید آج کے دور میں ناپید ہو۔ چنانچہ عبارت کی چھان بین اور نقد و پرک کے حوالے سے انہوں نے نہ صرف غلط یا زائد عبارت کی نشاندہی کے لئے مختلف قواعد

وضع کئے، بلکہ دو یکساں عبارتوں کی اجتماع کی صورت میں کونسی عبارت کو زائد اور کس کو اصل قرار دیا جائے، اس حوالے سے بھی غور کیا، چنانچہ ان میں دو طرح کی آراء عام تھیں:

1. کچھ علماء کا خیال تھا کہ مطلقاً دوسری عبارت کو خط کشیدہ کر دیا جائے اس لئے کہ پہلی عبارت اپنے اصل مقام پر آئی ہے۔[22]

2. دوسری رائے علامہ قاضی عیاض کی تھی، انہوں نے عبارت کے حسن اور رونق کو برقرار رکھنے کے لئے یہ طریقہ وضع کیا کہ اگر تکرار سطر کے شروع میں ہو تو دوسری عبارت کو خط کشیدہ کر دیا جائے ،اسی طرح اگر تکرار ایک سطر کے آخر اور دوسرے کے شروع میں ہو تو سطر کے آخر والی عبارت کو خط کشیدہ کر دیا جائے۔ لیکن اگر تکرار صرف سطر کے آخر میں ہو تو اول عبارت کو خط کشیدہ کیا جائے گا۔[23] گویا قاضی عیاضؒ نے صفحہ کے حسن اور رونق کو برقرار رکھنے کے لے سطر کے اول اور آخر میں تبدیلی کرنے کو مناسب نہیں سمجھا ہے۔

۵۔ آپس میں مشابہت رکھنے والے حروف:

عربی رسم الخط میں بعض حروف ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں، خاص طور پر جب انہیں نقطوں کے بغیر لکھا گیا ہو۔ مثلاً ب، ت، ث، ن، ی اسی طرح ج، ح، خ وغیرہ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے کے بعد ان حروف میں مشابہت کی وجہ سے تلبیس کے خوف سے ان کے اوپر نیچے نقطے لگا دیئے گئے۔ علماء متقدمین نے اس حوالے سے نہ صرف نقطوں اور اعراب کا اہتمام کیا بلکہ ان حروف کے با قاعدہ نام بھی مقرر کیئے مثلا حاء مہملہ، تاء مثناۃ وغیرہ۔

چنانچہ علامہ علمویؒ فرماتے ہیں:

> ''کاتب اپنی کتاب کا تقابل کسی اصل نسخے سے کر دے، تو اس کے بعد غیر واضح لفظ کی وضاحت کرے اور مشکل لفظ پر اعراب لگائے''[24]

بعض علماء نے اس معاملے میں انتہائی اہتمام و عرق انگیزی سے کام لیا ہے، چنانچہ انہوں نے الفاظ مہملہ کے با قاعدہ علامات مقرر کی تھیں بقول قاضی عیاضؒ:

> ''ہم مہمل حروف کی وضاحت کے لے با قاعدہ علامات استعمال کرتے تھے چنانچہ لفظ حاء کے نیچے چھوٹی سی حاء اور لفظ عین کے نیچے چھوٹا سا عین لکھد یتے تھے، یہی حال طاء، صاد اور راء کا تھا''[25]

علامہ ابن الصلاح اس حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

"اکثر لوگ اپنے ذہنوں پر اعتماد کرتے ہوئے عبارت پر نقطے اور اعراب لگانے میں سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں، جس کا انجام اچھا نہیں ہوتا ہے اس لیے کہ بھول چوک انسانی حقیقت کا ایک حصہ ہے، چنانچہ عبارت کو منقوط و معرب بنانے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے اس کی غرابت ختم ہو جاتی ہے اور قاری کسی دھوکے میں مبتلا نہیں رہتا ہے، لیکن اس طرح کی واضح عبارت پر اعراب لگانے سے گریز کیا جائے جس میں وہم والتباس کا خطرہ نہ ہو، چنانچہ کسی نے خوب کہاہے کہ "**انمايشكل مايشكل**"[26]

علماءِ متقدمین اعلام کے اعراب پر بھی بڑا زور دیتے تھے اس کی بنیادی وجہ یہ ہوتی تھی کہ اعلام کو عام عبارت کی طرح سیاق وسباق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔[27]

٦۔حاشیہ نگاری:

حاشیہ کا مطلب صفحہ کے دونوں جانبوں پر موجود خالی جگہ ہوتی ہے اس اعتبار سے یہ ھامش سے مختلف ہے، کیونکہ ھامش میں کاتب کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ بقدر ضرورت جگہ متعین کر دے جبکہ حاشیہ کو ایک محدود مسافت پر لکھنا ہوتا تھا، چونکہ حاشیہ کی جگہ محدود ہوتی تھی اس لیے قدیم مؤلفین اپنی تعلیقات کو صلب متن میں تنبیہ، قاعدہ یا تعلیق کا نام دے کر لکھتے تھے۔ یہ تو مؤلفین کا حال تھا، مگر جو علماء ان کتابوں کو پڑھتے تھے تو دوران مطالعہ ان کتابوں پر بعض تعلیقات بھی چڑھادیتے تھے جس کے لئے وہ حواشی کا استعمال کرتے تھے، چنانچہ اس حوالے سے ان کے ہاں باقاعدہ قواعد بھی موجود تھے۔ علامہ علمویؒ فرماتے ہیں:

"حاشیہ کی صورت میں اہم فوائد لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن حاشیہ کے آخر میں لفظ "صح" نہ لکھے بلکہ حاشیہ کی ترتیب ہندی اعداد کے لحاظ سے رکھے"[28]

البتہ بعض لوگوں کا طریقہ یہ بھی رہا ہے کہ وہ حاشیہ کی ابتدا میں لفظ "ح" لکھتے تھے۔[29] مگر اس بات کو ملحوظ نظر رکھا جائے کہ حاشیہ میں کتاب سے متعلقہ اہم باتوں کو لکھا جائے مثلاً کوئی اشکال، احتراز، غلطی یا تنبیہ وغیرہ۔ حاشیہ میں ایسے مسائل اور فروعات لکھنے سے احتراز کیا جائے جو کہ کاتب کے لئے باعث مشقت ہوں۔[30]

٧۔علامات ترقیم:

جدید دور میں جو علامات ترقیم استعمال ہوتی ہیں یہ متقدمین کے ہاں نہیں تھیں، چنانچہ ان کے ہاں نہ فاصلہ رائج تھا اور نہ ہی فاصلہ منقوطہ، اسی طرح وہ مروجہ علامات استفہام، تعجب اور قوسین کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے ان کے متبادل دوسرے اصطلاحات وضع کئے تھے، چنانچہ انہوں نے دو کلاموں کو الگ الگ ظاہر کرنے کے لئے نقطہ کے بجائے دائرہ کا استعمال کیا ہے۔[31] یہی وجہ ہے کہ قرآن

مجید میں بھی فصل بین الاٰیات کے لئے دائروں کا استعمال کیا گیا ہے، بعد میں ان دائروں میں اٰیات کا نمبر بھی لکھا جانے لگا۔

چنانچہ علامہ علموی کے بقول مناسب ہے کہ دو کلاموں کے درمیان فاصلہ کے لئے دائرہ کا استعمال کیا جائے، ایک ہی ڈگر پر مسلسل نہ چلا جائے، اس لئے کہ اس سے مقصود حاصل کرنے میں مشکل پیش آتی ہے، دائرہ کی مروجہ صورت یہ ہے (o) ۔[32] جہاں تک کسی اقتباس کو استعمال کرنے کا تعلق ہے تو علمائے متقدمین نے اگرچہ اقتباس ذکر کرنے کا حالیہ مروجہ طریقہ تو استعمال نہیں کیا، لیکن کلام کے اندر ایسا اشارہ کر جاتے تھے جس سے یہ بتلانا مقصود ہوتا تھا کہ یہ فلاں شخص یا فلاں کتاب سے ماخوذ ہے۔ اقتباس کے حوالے سے متقدمین عموماً یہ الفاظ استعمال کرتے تھے، **هذا كلام فلان / هذا الفاظ فلان / هذا قول فلان / هذا ما قاله فلان / الى هنا قول فلان / الى هنا عبارة فلان / انتهى ما ذكره فلان وغيره** ۔[33] اسی طرح جب ان کے پیش نظر کسی کلام کا اختصار ہوتا تو وہ اس کے آخر میں (اھ) لکھدیتے تھے چنانچہ خزانۃ الادب میں علامہ بغدادی (متوفی ۱۰۹۳ھ) کا یہ قول مذکور ہے: **ومثله للنحاس قال : والذى احفظه عن ابن كيسان : ان هذا على مذهب من قال هى جالسة، باسكان الياء وهذا قول حسن اه** ۔[34] اسی طرح علماء متقدمین نے اپنی کتابوں میں اختصاری نکتوں اور اشاروں سے بھی منع نہیں کیا ہے۔ چنانچہ علامہ علمویؒ فرماتے ہیں:

> "جس شخص نے اپنی کتاب میں مختلف اختصاری نکتے اور اشارات مقرر کئے تو گویا اس نے اپنی ایک اصطلاح قائم کر دی، ولا مشاحة فى الاصطلاح بشرطیکہ اس نے مقدمہ کتاب میں اپنی ان اصطلاحات کی وضاحت بھی کی ہو۔ چنانچہ اس طرز کو ہمارے ائمہ کی ایک بڑی جماعت نے بغرض اختصار اختیار کیا ہے"[35]

اسکی مثال فیروز آبادی کی وہ اختصاری اصطلاحات ہیں جو انہوں نے القاموس المحیط میں اختیار کیا ہے، مثلاً ج = جمع، م = معروف، ع = موضع، د = بلدۃ، ۃ = قریۃ، وغیرہ"۔[36]

۸۔ تحقیقی عمل کی اخلاقی اساسیات و آداب:

جدید تحقیق، تحقیقی عمل سے وابستہ افراد کی اخلاقی ذمہ داری قرار دیتی ہے کہ وہ ذرائع علم کا احترام کرے، کیونکہ ان کے بدولت علم میں اضافہ اور تحقیقی عمل کو وسعت ملتی ہے۔ خصوصاً اسلامیات کے طالب علم کے لے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ اس کا واسطہ براہ راست قرآن و حدیث سے پڑتا ہے۔ قدیم علماء تحقیقی عمل کے اس گوشے سے بھی غافل نہیں رہے، چنانچہ علامہ علموی طالب علم کے لے ضروری قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب طالب علم کسی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہے یا اس کو لکھنا چاہے تو اس کو زمین پر نہ پھیلائے بلکہ اونچی جگہ رکھے۔[37]

ویسے تو ان کے نزدیک تمام کتب قابل احترام تھیں ، لیکن تقابل کی صورت میں یہ طریقہ اپنایا جاتا تھا کہ جو فن زیادہ شرف وفضیلت والا ہو تا اس کی کتاب سب سے اوپر رکھدی جاتی، اس کے بعد حسب مرتبہ بالترتیب دوسری کتب رکھی جاتی تھی، چنانچہ وہ سب سے اوپر قرآن کریم اس کے بعد کتب حدیث، پھر کتب تفسیر اور علی ھٰذا القیاس فقہ، اصول الدین، نحو وصرف اور اشعار عرب کی کتب رکھی جاتی تھیں۔ اسی طرح اگر ایک ہی فن کی کئی کتابیں جمع ہوں تو ترتیب میں مصنف کے علوّ مرتبت کو مد نظر رکھا جاتا تھا[38].

۹۔ ذرائع علم کا حصول:

تحقیقی عمل کے لوازمات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ محقق حسب استطاعت تحقیق میں مددگار ذرائع کو خریدے، وگرنہ اجارتاً یا اعارتاً حاصل کرلے، قدماء نے ان ذرائع کو خریدنا زیادہ پسند فرمایا ہے، چنانچہ علامہ علمویؒ اسی بات پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"محقق کے لے کتاب عاریتاً لینے کے بجائے خریدنا زیادہ بہتر ہے"۔[39]

کتابوں کو عاریتاً دینے کے سلسلے میں ان علماء کی رائے جدید اصول لائبریری کے بالکل قریب ہے، کہ کتاب ایسے شخص کو عاریتاً دی جائے گی جو کتاب کے صفحات اور جلد کو نقصان نہ پہنچائے، عاریتاً کتاب دینے کے عمل کو سراہ گیاہے، چنانچہ امام وکیعؒ کا قول ہے کہ علم حدیث میں برکت کا بنیادی سبب کتابوں کو عاریت پر دیناہے۔ کتاب کے عاریتاً دینے کے سلسلہ میں بلاوجہ بخل کا مظاہرہ کرنے کو مذموم قرار دیا گیاہے، چنانچہ امام سفیان ثوریؒ کا قول ہے کہ جس نے بلاوجہ علم کے پھیلانے میں بخل کا مظاہرہ کیا تو وہ تین مصیبتوں میں گرفتار ہوگا۔ یا تو نسیان کا شکار ہوگا یا اس حال میں مرے گا کہ خلق خدا اس سے نفع حاصل نہ کر سکے گی اور یا اس کی کتابیں ضائع ہو جائیں گی۔ مگر جو شخص اصول عاریت کو پورا نہیں کرتا ہو، کتاب کو نقصان پہنچاتا ہو یا وقت مقررہ سے تاخیر کرتا ہو، تو ایسے شخص کو عاریتاً کتاب نہ دینا جائز ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی کا قول ہے کہ عاریت کی واپسی میں تاخیر کی صورت میں کئی علماء نے عاریت دینے سے منع کیا ہے۔[40]

۱۰۔ اصول کتابت:

علمائے متقدمین نے قارئین کی آسانی کے لئے چند اصول کتابت بھی وضع کیے ہیں جنکے مطالعہ کرنے سے پتا چلتاہے کہ ان قواعد کے بنانے میں انہوں نے کس قدر دقت نظری اور احتیاط سے کام لیاہے، من جملہ ان قواعد کے، تین قاعدے درج ذیل ہیں:

1. بلاوجہ خط کو باریک نہ کیا جائے اس لیے کہ اس سے قارئین کو پڑھنے میں دقت پیش آتی ہے، چنانچہ حنبل ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ مجھے امام احمد ابن حنبلؒ نے باریک لکھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اس طرح نہ لکھیں، کیونکہ زیادہ امکان اس بات کاہے کہ بعد میں یہ آپ کو سمجھ نہ آسکے۔ ایک بزرگ کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے باریک خط کو دیکھتے ہوئے فرمایا کہ مجھے لگتاہے کہ یہ لکھائی ایسے

شخص کی ہے جو اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ میرے بعد کوئی اس کو پڑھنے والا نہیں ہے۔ [41] لیکن اگر کسی عذر کی بنا پر باریک خط لکھا میں لکھا جائے مثلاً ورق چھوٹا ہو یا سفر کے واسطے چھوٹا نسخہ لکھنا مقصود ہو تو اس کی اجازت ہے۔

2. قدیم محققین نے خط کو خوبصورت بنانے کے لئے اصول کتابت کو نظر انداز کرنے کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا ہے بلکہ ان کے ہاں اصول کتابت کا اہتمام مقدم ہے اور حسن خط ثانوی درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ محقق کو چاہیے کہ اپنے خط میں مشق اور تعلیق کی بجائے تحقیق کو پیش نظر رکھے، چنانچہ حضرت قتیبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ بدترین لکھائی مشق ہے، اور سب سے اچھا خطوہ ہے جو کہ واضح کر کے لکھا جائے۔ فرماتے ہیں کہ بدترین لکھائی مشق ہے. [42] علامہ علمویؒ مزید واضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "حسن خط میں مبالغہ کے کرنے بجائے خط کی صحت پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیئے ،طالب علم تعلیق سے اجتناب کرے جو کہ بلاوجہ بعض حروف کو آپس میں خلط ملط کرنے کا نام ہے، اسی طرح مشق سے بھی اجتناب کرے جس میں حروف کو تیزی سے لکھتے ہوئے نامکمل لکھ دیا جاتا ہے" [43]

کتابت کے سلسلے میں قدیم محققین جس طرح ایسے الفاظ کے استعمال سے منع فرماتے تھے جو کہ مبہم اور غیر واضح ہوں، اسی طرح وہ ایسے انداز تحریر کو بھی کراہت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جو شک والتباس میں ڈال دے، چناچہ انہوں نے عبد اللہ بن فلاں بن فلاں یا عبد الرحمن بن فلاں یا اس جیسے دوسرے اسماء میں، جو کہ اللہ تعالیٰ کے بندہ ہونے کا معنی دیتے ہوں، اس بات کو ناپسند کیا ہے کہ لفظ "عبد" کو پہلے سطر کے آخر میں جبکہ لفظ اللہ کو مابقیہ نسب کے ساتھ دوسرے سطر کے شروع میں لکھ دیا جائے، اسی طرح یہ بھی نامناسب سمجھا ہے کہ ایک سطر کے آخر لفظ "رسول" جبکہ دوسرے سطر کے ابتداء میں "اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "کو لکھا جائے، [44] غرض یہ کہ جہاں جہاں بھی التباس کا خطرہ ہو وہاں پوری حزم واحتیاط سے کام لینا چاہیے۔

نتیجہ بحث:

خلاصہ کلام اس بحث کا یہ ہے کہ فن اصول تحقیق کے اصل موجد متقدمین مسلمان علماء ہیں، کیونکہ یورپ میں یہ عمل تقریباً پندرھویں صدی عیسوی میں ناقص طور پر اپنایا گیا تھا، چنانچہ یونانی ولاطینی لٹریچر کو باقاعدہ تصحیح کئے بغیر شائع کرنا شروع کر دیا گیا تھا، تقریباً تین صدیوں تک یہی عمل جاری رہا بعد ازاں انیسوی صدی کے نصف میں یہ علم وہاں ایک فن کے طور پر متعارف ہوا، جس کے لئے باقاعدہ اصول وقواعد مقرر ہوئے ۔اس اعتبار سے اگر عیسوی سال کا تقابل ہجری سال سے کیا جائے تو پندرھویں صدی عیسوی، آٹھویں صدی

ہجری بنتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اہل یورپ نے آٹھویں صدی ہجری میں اس فن کی ابتداء کی ہے اور بارہویں صدی ہجری تک اس کو اپنے عروج تک پہنچایا۔ جب کہ مسلمانوں نے چوتھی صدی ہجری سے ہی اس فن کی ابتداء کر لی تھی اور ساتویں صدی ہجری کے نصف تک اس فن کو اپنے عروج تک پہنچایا، چنانچہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور محدث امام حسن ابن خلاد الازھریؒ (متوفی ۳۶۰ھ) نے احادیث کے اسانید کی تصحیح وتضبیط سے متعلقہ قواعد پر مشتمل کتاب " المحدث الفاصل بین الراوی والواعی " لکھی، اسی طرح چھٹی اور ساتویں صدی کے اوائل میں علامہ قاضی عیاض (متوفی ۵۴۴ھ) نے کتاب " الالماع الی معرفۃ اصول الروایۃ وتقیید السماع " اور علامہ ابن الصلاح (متوفی ٦١٦ھ) نے "کتاب معرفۃ انواع علوم الحدیث (مقدمہ ابن الصلاح)" لکھی، ان کتابوں میں انھوں نے نصوص وعبارات کی حفاظت کے لئے نسخوں کا اصل کتاب سے تقابل، ان کے حواشی بنانے کا طریقہ، عبارت میں کمی وزیادتی کرنے کے اصول اور علامات ترقیم وغیرہ کا طرز تحریر، غرض کہ اس فن سے متعلقہ تمام ضروری امور سے بحث کی، اس تقابلی جائزہ سے نتیجتاً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جس وقت اہل یورپ اس فن کی ابتدا کر رہے تھے مسلمان اسے عروج کی انتہاء تک پہنچا چکے تھے

یہ بات صحیح ہے کہ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بتقاضائے احوال اس فن کے رموز واشارات، علامات ترقیم، حاشیہ کے طریقوں وغیرہ میں تبدیلی آتی رہی ہے یہی وجہ ہے کہ قدیم اور جدید اصولِ تحقیق مختلف ہیں، لیکن طرزِ تحقیق چاہے قدیم ہو یا جدید، قدر مشترک نصوص وعبارات کی تصحیح وحفاظت تھی۔ لہٰذا اگر مقصد ایک ہو تو طریقوں کو مقتضاء حال کے مطابق بدل دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

حواشی وحوالہ جات

[1] خورشید احمد، پروفیسر، تحقیق کے مغربی فلسفے اور اسلامی اسلوبِ تحقیق کی اساسیات، ترجمہ: ثروت جمال اصمعی، مغرب اور اسلام، شمارہ ۳۹، ۲۰۱۳ء۔

[2] رمضان، عبد التواب، مناہج تحقیق التراث بین القدامیٰ والمحدثین، مکتبۃ الخانجی، القاہرہ، طبع اول ۱۹۸۶ء، ص ۴

[3] فضلی، عبد الہادی، تحقیق التراث، مکتبۃ العلم جدۃ، طبع اول ۱۴۰۶ھ_۱۹۸۲ء، ص ۸

[4] ایضاً، ص ۱٦

[5] حسن بن عبد اللہ بن سعید العسکری (م ۳۸۲ھ) شرح مایقع فیہ التصحیف التحریف، مکتبہ مصطفی البابی الحلبی، مصر، ص ۱۳

[6] رمضان، عبد التواب، مناہج تحقیق التراث بین القدامیٰ والمحدثین، بحوالہ مذکورہ، ص ۱٦

[7] جوہری، ابو نصر اسماعیل (۳۹۵ھ)، الصحاح (تاج اللغۃ وصحاح العربیۃ)، داراحیاء التراث العربی بیروت، س ن، ج ۲، ص ۵٦۹

[8] وجادہ، وجد کا مصدر ہے اور اس کا معنی کسی چیز کو پانا ہے۔ تحمل حدیث کے مختلف طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے، جس میں کسی متعلم کو شیخ کے ہاتھ کا لکھا ہوا کوئی نسخہ احادیث مل جائے اور وہ طالب علم شیخ کی طرز تحریر سے بھی پورے

طور پر واقف ہو، لیکن نہ تو اس نے حدیث کو براہ راست سنا ہو اور نہ ہی اسے شیخ سے روایت کرنے کی اجازت ہی حاصل ہوئی ہو، واضح رہے کہ وجادہ کے ذریعے ملنے والی روایت کا حکم منقطع روایت جیسا ہوتا ہے، البتہ اس میں ایک قسم کا اتصال پایا جاتا ہے۔ اس کو ادا کرنے کے لئے یہ الفاظ ادا کئے جاتے ہیں، **"وجدت بخط فلان او قرات بخط فلان کذا"** یعنی "مجھے فلاں کی تحریر ملی ہے یا میں نے فلاں کی تحریر پڑھی ہے اور اس میں یہ لکھا ہے۔۔۔ "۔ اس کے بعد اسناد اور متن کو بیان کیا جاتا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: قاضی عیاض، الالماع، ص۱۱۶ تا ۱۲۱۔ ابن الصلاح، علوم الحدیث، ص۱۵۷ تا ۱۶۰۔ العراقی، شرح التبصرۃ والتذکرۃ، ج ۲، ص ۱۱۱ تا ۱۱۶ ۔ السیوطی، تدریب الراوی، ص ۲۸۱ تا ۲۸۵۔ السخاوی، شمس الدین عبد الرحمن، فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث، ج۲، ص ۵۲۰ تا ۵۳۰۔ الریاض: دار المنہاج، ۱۴۲۶ھ۔

[9] بنیادی طور پر اس تحقیقی عمل کے سلسلے میں ڈاکٹر عبد التواب رمضان کی کتاب "مناہج تحقیق التراث بین القدامیٰ والمحدثین" کو اصل بنایا ہے، لیکن ساتھ ساتھ دیگر کتابوں سے معاونت لیتے ہوئے تحقیقی بنیادوں پر حذف و اضافہ بھی کیا ہے۔

[10] علموی، موسیٰ ابن محمد، المعید فی ادب المفید والمستفید، المکتبۃ العربیۃ دمشق،، طبع اول ۱۳۴۹ھ، ص ۱۳۵

[11] حصبی، عیاض ابن موسیٰ (متوفی ۵۴۴ھ) ، الالماع الی معرفۃ اصول الروایۃ و تقیید السماع، دار التراث قاہرہ مصر، طبع اول ۱۳۸۹ھ، ص۱۵۹

[12] حموی، ابو عبد اللہ یاقوت ابن عبد اللہ الرومی (متوفی ۶۲۶ھ)، معجم الادباء، دار احیاء التراث العربی بیروت، س ن، ج۱۹، ص۱۶۷

[13] حصبی، عیاض ابن موسیٰ (متوفی ۵۴۴ھ) ، الالماع الی معرفۃ اصول الروایۃ و تقیید السماع، بحوالہ مذکورہ، ص ۱۸۵- ۱۸۶

[14] علموی، موسیٰ ابن محمد (۹۸۱ھ) ، المعید فی ادب المفید والمستفید، بحوالہ مذکورہ، ص۱۳۱

[15] شہر وزی، تقی الدین ابو عمرو عثمان ابن صلاح الدین (متوفی ۶۱۶ھ)، مقدمۃ ابن الصلاح، کتاب معرفۃ انواع علوم الحدیث، المطبعۃ القیمۃ بمبی، طبع رابع ۱۳۵۷ھ ص۹۵_۹۶

[16] علموی، موسیٰ ابن محمد (۹۸۱ھ) ، المعید فی ادب المفید والمستفید، بحوالہ مذکورہ، ص۱۳۶

[17] قاضی عیاض، الالماع الی معرفۃ اصول الروایۃ و تقیید السماع، بحوالہ مذکورہ، ص۱۶۹

[18] ثعالبی، ابو منصور عبد الملک نیشاپوری (۴۲۹ھ) ، یتیمۃ الدہر، دار الکتب العلمیۃ بیروت، طبع اول ۱۴۲۰ھ_۲۰۰۰ء، ج۳، ص۱۹۷

[19] قاضی عیاض، الالماع الی معرفۃ اصول الروایۃ و تقیید السماع، بحوالہ مذکورہ، ص۱۶۲

[20] ایضاً، ص۱۶۴

[21] رمضان، عبد التواب، مناہج تحقیق التراث بین القدامیٰ والمحدثین، بحوالہ مذکورہ، ص۷۳ ملخصاً

[22] ایضاً، ص۳۸

[23] قاضی عیاض، الالماع الی معرفۃ اصول الروایۃ و تقیید السماع، بحوالہ مذکورہ، ص۱۷۲ ملخصاً

[24] علموی، المعید فی ادب المفید والمستفید، بحوالہ مذکورہ، ص۱۳۶

[25] قاضی عیاض، الالماع الی معرفۃ اصول الروایۃ و تقیید السماع، بحوالہ مذکورہ، ص۱۵۷

[26]شہرزوری، تقی الدین ابوعمرو عثمان ابن صلاح الدین (متوفی ۶۱۶ھ)، مقدمۃ ابن الصلاح، کتاب معرفۃ انواع علوم الحدیث، بحوالہ مذکورہ، ص۹۸

[27]الالماع الی معرفۃ اصول الروایۃ و تقیید السماع، بحوالہ مذکورہ، ص۱۴۹

[28]علموی، المعید فی ادب المفید والمستفید، بحوالہ مذکورہ، ص۱۳۹

[29]رمضان، عبدالتواب، مناہج تحقیق التراث بین القدامیٰ والمحدثین، بحوالہ مذکورہ، ص۴۱

[30]علموی، المعید فی ادب المفید والمستفید، بحوالہ مذکورہ، ص۱۳۹

[31]رمضان عبدالتواب، مناہج تحقیق التراث بین القدامیٰ والمحدثین، بحوالہ مذکورہ، ص۴۳

[32]علموی، المعید فی ادب المفید والمستفید، بحوالہ مذکورہ، ص۱۳۸

[33]رمضان، عبدالتواب، مناہج تحقیق التراث بین القدامیٰ والمحدثین، بحوالہ مذکورہ، ص۴۳

[34]بغدادی، عبدالقادر ابن عمر (متوفی ۱۰۹۳ھ)، خزانۃ الادب، دارالکتب العلمیۃ بیروت، طبع اول ۱۴۱۸ھ_۱۹۹۸ء، ج۲، ص۵

[35]علموی، المعید فی ادب المفید والمستفید، بحوالہ مذکورہ، ص۱۳۹

[36]رمضان، عبدالتواب، مناہج تحقیق التراث بین القدامیٰ والمحدثین، بحوالہ مذکورہ، ص۴۴

[37]علموی، المعید فی ادب المفید والمستفید، بحوالہ مذکورہ، ص۱۳۱

[38]ایضاً، ص۱۳۱ ملخصًا

[39]شہرزوری، مقدمۃ ابن الصلاح، کتاب معرفۃ انواع علوم الحدیث، بحوالہ مذکورہ، ص۸۹

[40]علموی، المعید فی ادب المفید والمستفید، بحوالہ مذکورہ، ص۱۳۱--۱۳۰

[41]شہرزوری، مقدمۃ ابن الصلاح، کتاب معرفۃ انواع علوم الحدیث، بحوالہ مذکورہ، ص۸۹

[42]ایضاً، ص۸۹

[43]علموی، المعید فی ادب المفید والمستفید، بحوالہ مذکورہ، ص۱۳۳

[44]ایضاً، ص۱۳۳ ملخصًا